

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹۷، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

کلام میر کے ایرانی سروکار

محمد رؤف بھٹی، پی ایچ ڈی

اسسٹنٹ پروفیسر اردو

گورنمنٹ گریجویٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد

IRANIAN CONCERNS IN KALAM-E MIR

Muhammad Rauf Bhatti, PhD

Assistant Professor of Urdu

Govt. Graduate College Samanabad, Faisalabad

Abstract

Urdu poetry has been dependent upon Persian poetics to a long extent. Prominent poets like Ghalib, Iqbal and Rashid etc. have shown keen interest in following the Iranian poetics. It's why Iranian landscape and other cultural concerns can easily be traced in poetic tradition of Urdu. Although most of poets have abided by the Persian poetics and felt proud of it, yet Mir Taqi Mir was the first Urdu poet who came with a counter narrative in this respect. He has not only paved the way of using Iranian perspective in Urdu poetry with great creativity but also introduced 'Rekhta' parallel to Ghazal with full confidence for the first time. The article is a study of Iranian concerns found in the verse of Mir.

Keywords:

Mir Taqi Mir, Ghalib, Iqbal, Rashid, Rekhta, Urdu, Poetry, Persian

اہل مغرب میں مثل مشہور ہے کہ ہر شخص دو وطنوں کا باسی ہوتا ہے: ایک اپنے جغرافیائی وطن مالوف کا اور دوسرا اپنے ثقافتی مرکز یعنی فرانس کا۔ فرانس کو مغربی تہذیب و تمدن کا نمائندہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہم مشرقی لوگوں کے لیے ایسا ثقافتی قبلہ و کعبہ ایران قرار پائے گا۔ اس سرزمین میں آریاؤں، زرتشتیوں اور مہاتما بدھ کے پیروکاروں نے تہذیب و تمدن کے ان مٹ نفوش چھوڑے، جنہیں اسلامیان ہند نے مزید آب و تاب دے کر اس قدر ارفع و اعلیٰ کر دکھایا تھا کہ مغربی اقوام بھی ایک مدت تک جس کی شرمندہ احسان رہیں۔ ایسے میں ہم ایرانی سرزمین کو مشرق والوں کا فرانس یا اہل شرق کا دوسرا وطن قرار دیں تو بے جا نہ ہو گا۔

شعر و ادب میں اس مردم خیز خطے نے ہمیشہ اقوام مشرق کی رہنمائی کی ہے۔ اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف سخن کا علمیاتی اور وجودیاتی سرمایہ فارسی زبان کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شعر افارسی گو شاعروں کے سامنے سرنیہوڑائے ملتے ہیں بہ جز خدائے سخن میر تقی میر (۱۷۲۳ء-۱۸۱۰ء) کے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے کہ موصوف کیا پُر اعتماد انداز میں حسن تعلیٰ کا اہتمام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریتے کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا (۱)

میر نے ساری زندگی ایرانی سرزمین پر قدم نہیں رکھا مگر ان کی نگارشات سے پتا چلتا ہے کہ انھیں علم و ادب کے اس عظیم مرکز سے گہری دل چسپی تھی۔ البتہ واقعہ یہ ہے کہ وہ یہاں کے اکابرین سے اس طرح متاثر نظر نہیں آتے جس طرح ان کے معاصرین یا مابعد کے بڑے بڑے دانش ور مثلاً غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) اور اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اس بات کے مدّعی ہیں کہ ان کا ساحرانہ کلام اہل ایران کو بھی برابر مسحور کیے ہوئے ہے؛ لہذا بڑے فاخرانہ لہجے میں تسطیر کیے جاتے ہیں:

بہ ایراں می روم دہ پانزدہ بیتم عنایت کن
رہ آوردے ست میر آشعار تو اہل صفہاں را (۲)

ترجمہ: ایران کو جا رہا ہوں دس پندرہ اشعار مجھے عنایت کر، میر تیرے اشعار اہل صفہاں کے لیے تحفہ ہیں۔

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

گذشتِ نوبتِ قدسی و صائب و طغرا

درین زمان ہمہ دیوانِ میر می خوانند (۳)

ترجمہ: قدسی، صائب اور طغرا کی نوبت گزر گئی، اس زمانے میں سب میر کا دیوان پڑھتے ہیں۔

عہد میر سے دو سو سال بعد کے ان بے لاگ فیصلوں کا تناظر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ شعر العجم کے فاضل مصنف نے جب ایک عام سے شاعر ولی دشت بیاضی کو ”فارسی شاعری کا میر تقی میر“ کہا تھا تو ان کے سامنے تقابلی ادب کے کون سے شعر یاتی پیمانے رہے ہوں گے۔ ایرانی ادبیات کے حوالے سے میر تقی میر کی یہ تاریخی بیانیہ شکنی (Historic Narrative Deconstruction) اہل نظر کی توجہ چاہتی ہے۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نشو و ارتقا میں ایرانی معاشرے کی اقدار اور روایات کا ایک کلیدی کردار رہا ہے۔ اس ہمسایہ ملک سے ہمارے صرف جغرافیائی خدو خال ہی مشترک نہیں بل کہ واقعہ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلم سماج کے عمرانی وجود کو نشو و ارتقا دینے میں بھی خوبانِ پارسی گو پیش پیش رہے ہیں۔ یوں بھی بعض محققین لفظ ”ایران“ کو ”آریانہ“ سے مشتق خیال کرتے ہوئے اس ملک کو آریاؤں کی سر زمین گردانتے ہیں اور یوں برصغیر کے لیے اس خطے کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں رہتی۔ اشاعتِ اسلام کے بہ موجب یہاں کے آتش کدے گل و گلزار میں بدل گئے۔ سلمانِ فارسی کے فقر غیور اور حدیفہ یمانی (م: ۶۵۶ء) کے اخلاص عمل سے مانی (۲۱۶ء-۲۷۶ء) اور زر تشتی (ما قبل: ۵۰۰ء) تعلیمات کی پیروکار اسی قوم سے ابوحنیفہ (۶۹۹ء-۷۶۷ء) جیسے فقیہ، نافع بن کاؤس جیسے محدث اور حسن بصری (۶۴۱ء-۷۲۸ء) جیسے زہد و صفا کے پیکر منظر عام پر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اہل ایران نے اسلامی فکر و فلسفے اور عملی زندگی میں قائدانہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا جو کسی نہ کسی صورت میں لمحہء موجود تک برابر جاری و ساری ہے۔ الغرض اہل اسلام اور بالخصوص مشرقی سر زمین میں پھیلنے پھولنے والی تہذیب و ثقافت کی نشو و ارتقا میں اس مردم خیز خطے کی خدمات نہایت قابل ذکر ہیں۔ اب چوں کہ شعر و ادب کسی قوم کے تہذیبی تشخص کے لیے ایک ادبی تاریخ کا درجہ رکھتا ہے لہذا ہندوستان کے مقامی ادب میں اس سر زمین کے حسین و جمیل منظر نامے اور فکری و فنی رویوں کا در آنا ایک لازمی امر تھا۔

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹۷، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

فارسی زبان طویل عرصے تک ہندوستانی مقتدرہ کا وسیلہء اظہار رہی اور ہندوستان کے بلند پایہ شعر اس زبان میں اظہار خیال کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر خیال کرتے رہے ہیں۔ مرزا غالب اپنے فارسی کلام کے سامنے اردو شاعری کو ہچکچاتے تھے:

فارسی بین تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہء اردو کہ بے رنگ من است (۴)

ترجمہ: اگر تجھے نوبہ نو نظاروں کی خواہش ہے تو میرا فارسی کلام ملاحظہ کر۔ یہ مجموعہ اردو کلام تو بے رنگ چیز ہے اسے نظر انداز ہی کرنا چاہیے۔

اسی طرح علامہ اقبال کو بھی فارسی گوئی سے عشق رہا اور انھوں نے بھی اپنا بیشتر کلام اسی زبان میں پیش کرنا پسند فرمایا۔ علامہ کی نظر میں تو یہ سرزمین اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ وہ اسے کرۂ ارض کے بہتر مستقبل کے لیے اقوامِ مشرق کا مشترکہ مرکز بنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں:

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے (۵)

اقبال کے بعد ادبی منظر نامے پر ابھرنے والے ایک اہم شاعر ن م راشد (۱۹۱۰ء-۱۹۷۵ء) نے اپنے ایک شعری مجموعے ایران میں اجنبی کی فکری بنیادیں ہی اس حریت پسند سماج کے عمرانی و ثقافتی تشخص کو نمایاں کرنے پر استوار کی ہیں۔ ان کی نظمیں ”تیل کے سوداگر“ اور ”وزیر چینس“ وغیرہ یا پروین شاکر کی علامتی نظم ”ایران“ اس ضمن میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

عہدِ حاضر میں اردو کے شعری افق پر ایرانیات کے آثار روشن تر ہوتے جا رہے ہیں مگر اس روایت کے ابتدائی سلسلوں میں میر تقی میر کا کلام ایک گم شدہ کڑی کی طرح موجود ہے۔ میر کی کارگاہ فکر میں ڈھلنے والی ایرانی حسیات اس بنا پر بھی توجہ طلب ہیں کہ انھوں نے فارسیت کی کورانہ تقلید کے بہ جائے نہ صرف اس زبان سے تخلیقی نوعیت کے اخذ و قبول کے ساتھ فکری و فنی سطح پر ریختہ گوئی کو اس کے مقابل کھڑا کرنے کا عندیہ دیا بلکہ اس کے لیے ایک مضبوط متبادل منطق یعنی نئے بیانیے کی نظری بنیاد بھی فراہم کی۔ یوں تو میر تقی میر کا اپنے کلام کو فارسی شعر کے مقابل رکھ کر تخلیقی مبارزت طلبی کی فضا پیدا کرنا فی نفسہ ایک قابلِ مطالعہ امر ہے مگر اس سے کہیں زیادہ یہ ادبی منظر نامہ مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ ان سے قبل

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

خوبانِ پارسی گو ہمارے مقامی شعر اکو بری طرح اپنی زلفِ گرہ گیر کے اسیر بنائے ہوئے تھے جب کہ میر نے آکر ہمیں اپنی شعر یاتی بنیادوں پر فخر کرنے کا سامان فراہم کیا اور اردو شاعری کو تقلید محض کی روش سے ہٹا کر تخلیقی رفعت کے مقامی سوتوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس دور میں فارسی سے مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ ہمارے شعر اہندوستانی سماج کا تہذیبی عرف خیال کی جانے والی صنفِ غزل کی تمام تر شعریات کو اپنے تخلیقی عمل میں ڈھالنے کے باوجود ”ریختہ“ کہہ کر پکارتے تھے جس کا ایک مفہوم گری پڑی چیز بھی تھا یہ ہند ایرانی بیانیہ آرائی کا ایک ساختیہ تھا۔ اسی بیانیہ کے پروردہ قائم چاند پوری (۱۷۲۲ء-۱۷۹۳ء) کا ایک شعر دیکھیے:

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی (۶)

ہماری ادبی تاریخ کے معاصر قرائن کی رو سے یہ شعر اٹھارویں صدی کے وسط میں موزوں کیا گیا معلوم ہوتا ہے جب کہ میر تقی میر بھی اردو ادب کے شعری افق پر پوری آن بان کے ساتھ اپنے تخلیقی جوہر دکھا رہے تھے۔ غالباً ٹھیک اسی عہد میں انھوں نے امیر خسرو (۱۲۵۳ء-۱۳۲۵ء) کے عہد سے چلی آرہی ایرانی غزل اور مقامی ریختہ کی اس مناقشانہ بحث میں اپنی فیصلہ کن فکری حیثیت واضح کرتے ہوئے اپنے پروقار رد عمل کی عملی مثال فراہم کی اور یوں صنفِ غزل میں ایک ذولسانی تقابلی منظر نامے کے خدو خال بہ دستور متوازن ہوتے چلے گئے۔ اس مضبوط تخلیقی استدلال کی حامل بیانیہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریختہ گوئی کی یہ جدید درجہ بندی بہت تیزی سے مقبول ہونے لگی جس کا ثبوت ہمیں غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۴۸ء-۱۸۲۴ء) کے آٹھویں دیوان میں جو ان کی وفات یعنی ۱۸۲۴ء سے کچھ ہی عرصہ قبل مکمل ہوا تھا، یوں ملتا ہے:

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل
معتقد اب کوئی کیوں سعدی و خسرو کا ہو (۷)

ظاہر ہے کہ یہاں ریختہ کو اس کے لچر پن سے نکلانے کے لیے اسے ”غزل طور“ کرنے کی شرط نہیں رکھی گئی بل کہ یہ اپنے نفس الامر ہی میں فارسی غزل کے مقابل کی چیز اور ”سبکِ ہندی“ کی حامل ایک باعتبار صنف قرار پائی۔ میر تقی میر نے اردو غزل گوئی کی طرز خاص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

شورِ تو عندلیب جگر چاک می کند
آموختی ز میر مگر طرزِ نالہ را (۸)

ترجمہ: عندلیب تیرا شور جگر کو چاک کرتا ہے، تو نے ضرور میر سے نالہ کے طرز کو سیکھا ہے۔

یقیناً فارسی غزل گوئی کی شان دار تاریخ میر کے سامنے تھی مگر انھیں اپنی استادانہ حیثیت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ وہ گاہے بہ گاہے اہل فارس کے مقابل اپنی تقابلی عظمت کی دھاڑ بھی لگاتے رہتے ہیں، اور لا محالہ ایسی جسارت صرف انھی کو زیبا تھی۔ مرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں ریختہ کو ”رُشکِ فارسی“ کہا ضرور ہے (۹) مگر میر کی طرح وہ فارسی شعر کے سامنے اپنی بڑائی کا عندیہ نہیں دیتے۔ شاید انھیں بھی اس بات کا بہ خوبی احساس تھا کہ ”پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منہ پر“ خدائے سخن میر تقی میر کے متعلق ادبی تاریخ کی اس انتقادی سچائی کو تخلیقی رنگ میں پیش کرتے ہوئے انور مسعود لکھتے ہیں:

شاعری اس کی پوچھتے کیا ہو
ریختے کی طلسم کاری ہے
ایسی بھرپور نشتریت سے
فارسی شاعری بھی عاری ہے (۱۰)

قدِ فارسی کے مقابل کلام میر کے لیے ایسا دو ٹوک فیصلہ ادبی محاذ پر ایک نئی جنگ چھیڑنے کا باعث بن سکتا ہے مگر فارسی شاعری کے گہنی کا یہ بیانیہ محض ایک کذب بیانی (Pseudo Statement) کا حامل نہیں بل کہ یہ امر واقعہ ہے کہ میر کے کلام میں جذبات و افکار کا انجذاب کچھ ایسی ساحرانہ فن کاری سے ہوا ہے کہ ان کی شاعری واقعی رفعت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میر کی طرح ہمارے مختلف ادبی فلسفیوں اور معتبر نقادوں نے بھی ان کی شعریاتی عظمت کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے انھیں اردو کے ساتھ فارسی زبان کے عظیم شعرا کے ساتھ رکھ کر دیکھا اور استنباطِ نتائج کے طور پر کلام میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ لہذا اسی ضمن میں عہدِ حاضر کے ایک معروف ادبی دانش ور احمد جاوید (پ: ۱۹۳۸ء) اپنے مضمون ”میر کی عظمت کا ایک سبب“ میں لکھتے ہیں:

”شاعری عظمت کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس میں وہ جمالیاتی زور نہ پایا جائے جس کے حاصلات خالص عقلی تفکر کی رسائی سے باہر ہوں اور اس کے لیے قابلِ قبول ہوں

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹۷، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

--- یہ وہ مرتبہ ہے جو عقل کو انتہائی مطلوب ہے مگر وہ یہاں تک رسائی نہیں رکھتی۔
غرض معنی کو عقل کی پہنچ سے باہر پہنچا دینا میر کا وہ کمال ہے جس میں اردو ہی نہیں بل کہ
فارسی کا بھی کوئی شاعر ان کی برابری نہیں کر سکتا۔“ (۱۱)

یہ امر واقعہ ہے کہ میر کو کم عمری میں ہی کاروانِ سخن وری کا پیشوا مان لیا گیا تھا اور معاصر
شعرا کھلے دل سے ان کی استادانہ حیثیت تسلیم کرتے تھے۔ میر کی اس شاعرانہ عظمت میں اردو کے ساتھ
فارسی تخلیقات کا بھی برابر عمل دخل رہا تھا مگر یہ شاعری نوآبادیاتی پر چھائیوں میں گھرے ہندوستان میں
فارسیّت کی سرِ بازاری کے بہ موجب بیوہ کی جوانی کے مانند ایک شان دار مگر ماند پڑتی روایت کی مثال ثابت
ہوئی جسے بہ وجہ تناسب توجہ نہ مل سکی۔ میر نے تیس بتیس سال کی عمر کے ایک خاص جذباتی مرحلے میں
اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو (۱۶۷۹ء-۱۷۵۶ء) سے عائلی کشیدگی کے دوران میں یہ فارسی دیوان مکمل کیا
اور بعد ازاں پھر اردو سخن سازی کی طرف مائل ہو گئے جو فی نفسہ ایک نتیجہ خیز بدلاؤ تھا؛ البتہ ستم ظریفی
دیکھیے کہ ان کا یہ کلام ۱۹۸۳ء میں رسالہ نقوش کے میر نمبر میں چھپنے سے قبل تک پردہ اخفائیں پڑا رہا۔
فی زمانہ مسعود حسن رضوی کا مرتب کردہ یہ کلام افضل احمد سید (پ: ۱۹۴۶ء) نے ۲۰۱۳ء میں اردو ترجمے
کے ساتھ شائع کیا ہے مگر اب نہ صرف فارسی ادب کے لیے التفاتِ دلِ دوستان میں شدید کمی واقع ہو چکی
تھی بل کہ غالب، اقبال، فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء)، راشد اور مجید امجد (۱۹۱۴ء-۱۹۷۴ء) کے ایسے مابعد کے
جدید شاعروں کی طرف توجہ مبذول ہونے کی بنا پر بھی اس پر کماحقہ، غور و خوض نہیں کیا جاسکا۔ میر کا یہ
کلام بیسویں صدی کی بہت بڑی ادبی یافت ہے مگر فکر و فن کے اس ”جہان دیگر“ سے اہل نظر کا یوں سرسری
گزر جانا باعثِ افسوس ہی نہیں عبرت آموز بھی ہے۔ مذکورہ دیوان کے علاوہ ان کی کئی دیگر تصانیف مثلاً
ذکرِ میر، نکات الشعر اور فیض میر جیسے فارسی ادب کے دیگر شہ پارے بھی اسی کم نگاہی کا شکار نظر آتے ہیں۔
فارسی زبان کا ہندوستانی سماج میں اثر و نفوذ بالخصوص افغانی حملہ آوروں کے ورود کا نتیجہ ہے جسے
بعد ازاں مغل حکمرانوں نے مزید بڑھا دیا اور ان کی سرپرستی میں ہزاروں ایرانی شعرا وادبا بھی یہاں کھنچے
چلے آئے۔ امرا و سلاطین کی نظر عنایت کے سبب انھیں مقامی معاشرے میں بھرپور پذیرائی ملی۔ جب
ہندوستانی ادبانے اپنی نگارشات فارسی میں ڈھالنا شروع کیں تو ان میں باہمی معاصرانہ چشمک رنگ دکھانے
لگی۔ اردو شاعری کے شروعاتی ادوار سے ہی ہمیں ایسی مناظراتی خاصیتوں کے آثار ملنے لگتے ہیں۔

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

امیر خسرو سے لے کر غالب تک ایسے لسانی مناقشوں پر مشتمل ایک دل چسپ مسابقتی صورت حال دیدنی و شنیدنی ہے۔ عرفی (۱۵۵۵ء-۱۵۹۱ء) اور فیضی (۱۵۷۴ء-۱۵۹۵ء) کی ان بن، سعدی (۱۲۱۰ء-۱۲۹۲ء) اور فیضی میں ”آسانی داد“ کے جیسی لطیفہ گوئی کہ جن میں ”سخن فہمی عالم بالا معلوم شد“ جیسی طنزیں موزوں ہوں، ملائید کی منطقی لکار اور شیخ علی حزیں (۱۶۹۲ء-۱۷۶۶ء) کے فاخرانہ وار، الغرض غالب تک آتے آتے دلائل و براہین کی قطع و برید کے دل چسپ نظارے قدم قدم پہ ایسی دعوتِ نظارہ ہیں کہ: زباں تھک گئی مر حبا کہتے کہتے۔ یہ منظر نامہ بھی سامنے رہے کہ ایران میں صفوی بادشاہوں کے عہد (۱۵۰۱ء تا ۱۷۳۲ء) میں ایرانیت پرستی اور دوسرے معاشرتی و مذہبی رجحانات کے زیر اثر یہ سلطنت دیگر بہت سے فارسی خواں علاقوں سے دور ہوتی گئی جس کے نتیجے میں ماوراء الہند اور سلطنت عثمانیہ کے محروسہ ممالک بہ تدریج ترکی کی طرف راغب ہو گئے۔ بعد ازاں جب مغلیہ حکومت رو بہ زوال ہوئی اور یورپی اقوام کا اثر و نفوذ بہ تدریج بڑھتا چلا گیا تو فارسی کے بہ جائے انگریزی کا سکد رواں ہوا جس کے سائے سائے اردو زبان ایک معیاری طرزِ اظہار کے طور پر ابھرنے لگی۔ اس بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی منظر نامے میں میر تقی میر نے ایک مہان تخلیق کار کی طرح خود کو مقامیت کی قید سے آزاد رکھتے ہوئے فارسی فکر و فن سے بھرپور اخذ و استفادہ کیا ہے۔ ان کی نگارشات میں ایرانی تہذیب و ثقافت کے آثار بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے یہاں کے مشاہیر، جغرافیائی خد و خال، رسم و رواج، ضرب الامثال، تلمیحات اور مقامی کچھر کے دیگر لوازمات کے ساتھ اس خطے کے دل فریب موسموں یا اس کی خوش گوار آب و ہوا کے زیر اثر سبزہ و گل کی نیرنگیوں کو اپنی کار گاہ فکر میں رکھ کر ایسی ایسی جمال آفریں تمثال کاریاں کی ہیں کہ قاری کی سماعت بصارت میں بدل جاتی ہے۔ ان کے کلام میں سعدی، صائب (۱۵۹۲ء-۱۶۷۶ء)، طغرا (م: ۱۶۶۷ء)، احمد جام (۱۰۴۸ء-۱۱۴۱ء) جیسے شاعروں کا ذکر اور شیریں فرہاد، جام جمشید، عندلیب ہزار داستان، سرو سہی، گل لالہ، گل تریاک، گرگ و میش، گرگ پائیز دیدہ، شاہان کج کلاہ، مغنچے اور پارسی تہذیب کے نوع بہ نوع عناصر کے ترجمان الفاظ و تراکیب خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ایران کے ایک شہر ”سبزوار“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شد بہ ہر شاخ ماتم بلبل
باغ گوئی کہ سبز وارے بود (۱۲)

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

ترجمہ: ہر شاخ پر بلبل کا ماتم تھا، باغِ تُو کبے کہ ”سبزوار“ تھا۔

اسی طرح ایرانی سرزمین کی ایک معروف نہر کو یوں تخلیقی پیراہن عطا کیا ہے:

اشک چوں الماس می ریزم ز مرگاں در برم

نہر الماس است گویا میرِ ایں چشمِ گرم (۱۳)

ترجمہ: پلکوں سے الماس جیسے آنسو میری گود میں گرتے ہیں، میر میری یہ چشمِ تر گویا نہر الماس ہے۔

میر نے وسعتِ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارسی کے عظیم تخلیق کار شعرا سے

اخذ واستفادے میں ہمیشہ بے تعصبی دکھائی ہے، تاہم بعض اوقات تو یہ اخذ و قبول تخلیقی سے زیادہ عام

تقلیدی سطح پر اترتا محسوس ہوتا ہے۔ چند فارسی شعرا کے حوالے سے میر کا ایک شعر دیکھیے:

کلام میر:

شد گلستان از خیال دلبران زندانِ من

یوسفستان گشت آخر کلبہء احزانِ من (۱۴)

ترجمہ: دلبروں کے خیال سے میر ازنداں گلستان بن گیا، میر اکلبہ احزانِ من آخر یوسفستان بن گیا۔

فارسی شاعر:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعانِ غم مخور

کلبہء احزان شود روزے گلستانِ غم مخور (۱۵)

ترجمہ: گم شدہ یوسف آخر مل جائے گا، اور ایک نہ ایک دن غم کدہ بھی گلستان ہو کر رہے گا، اس لیے غم نہ

کیا کرو۔

کلام میر:

اول زمینوں میں ہو مائل مری طرف

جو حادثہ نزول کرے آسمان سے (۱۶)

فارسی شاعر:

ہر بلائے کز آسماں آید

گرچہ بر دیگرے قضا باشد

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

بر زمین نا رسیدہ می پرسد
خانہ انوری کجا باشد (۱۷)

ترجمہ: آسمان سے جو بلا بھی نازل ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی دوسرے کی قضا بن کر آئی ہو، زمین پر پہنچتے ہی دریافت کرتی ہے کہ انوری کا گھر کہاں ہے۔

منہ چاہیے جو کوئی کسی سے حساب لے
ناکس سے گفت گو نہیں روز شمار میں (۱۸)
زہول روز جزا آذری چہ می ترسی
تو کیستی کہ در آں روز در شمار آئی (۱۹)

ترجمہ: اے آذری! روز جزا کی ہولناکی سے تو کیوں خائف ہے؟ تو ہے کیا ہے، جو اس روز شمار قطار میں آئے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی (۱۶۶۷ء-۱۷۰۷ء) کو فارسی ادب سے خوشہ چینی کا جو مشورہ دیا تھا اس پر بہ رنگِ دگر یعنی تقلیدی اخذ و استفادے کے برعکس تخلیقی انجذاب کی صورت میں نے بہ درجہ کمال پہرہ دیا ہے اور بنا بریں انھوں نے اپنے کلام میں فکر و فن کے ایسے ایسے گوہر ٹانک دیے ہیں کہ دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی۔ انھوں نے فارسی کے حافظ، عرفی، نظیری (۱۵۶۰ء-۱۶۱۲ء)، صائب، غنی کاشمیری (۱۶۳۰ء-۱۶۶۹ء) اور حکیم سنائی (۱۰۸۰ء-۱۱۳۱ء) وغیرہ سے بالخصوص فنی ارتباط روار کھا ہے۔ ایرانی سرزمین اپنی نباتاتی جمالیات کے لیے خاص شہرہ رکھتی ہے۔ اعلیٰ قسم کے انگوروں کے لیے یہ خطہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس خمار آفرین پھل کی بلیں ایک خاص قسم کی چھال سے بنی رسیوں یا فولادی تاروں پر چڑھائی جاتی ہیں جنھیں مقامی لوگ ”دار بست“ یعنی ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ میر نے ان مخصوص تاروں کا ذکر اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:

سوئے مرگان می نگر در گریہ سرشارِ صبح
خوشہ خوشہ می چکد خونِ جگر زین دار بست (۲۰)

ترجمہ: میری پلوں کی طرف دیکھو، صبح آنسوؤں سے رونے کی وجہ سے خونِ جگر خوشہ خوشہ اس دار بست سے ٹپک رہا ہے۔

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

شہانِ ایران کو ایک خاص ادائے شہائی کی بنا پر ”کج کلاہ“ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ میر نے اپنی ایک فارسی مثنوی میں دلی کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس لفظ کو یوں تخلیقی پیراہن عطا کیا ہے:

حالیہ اس شہر و شہائی از تو شد
چند روزے کج کلاہی از تو شد (۲۱)

ترجمہ: اس زمانے میں یہ شہر اور شہائی تجھ سے ہے، چند روز کج کلاہی تجھ سے ہے۔

اسی طرح انھیں ایرانی نژاد صوفیہ کرام سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ ایک معروف ایرانی بزرگ سے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے لکھتے ہیں جن کے نام کی رعایت سے انھیں خمریہ شعروں میں خوب یاد کیا جاتا ہے:

زجوش شوق چون مستِ شراب می گردم
مرید احمد جامِ خراب می گردم (۲۲)

ترجمہ: شوق کے جوش سے مست شراب کی طرح ہو رہا ہوں۔ احمد جام کا مرید ہوں، خراب ہو رہا ہوں۔

الغرض میر نے اپنے شعر و ادب میں ایرانیات سے گہرے تخلیقی ربط و تعلق کا اظہار کیا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ایرانی فکر و فلسفے سے اہل ہند کا تعلق تقلید محض کے دائرے سے نکل کر تخلیقی ربط ضبط (Creative Inter-action) کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ میر نے خود بھی ایک بڑے تخلیق کار کی طرح بھرپور ادبی اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے فارسی ادب سے اخذ و قبول کے واضح اشارے دیے ہیں، البتہ فارسی فکر و فن کے اس اکتسابی تعامل کو اپنی طرزِ خاص میں ڈھال کر خود اہل فارس کے لیے قابلِ رشک بھی بنادیا ہے؛ لہذا بڑے وثوق سے کہتے ہیں:

تبعیت سے جو فارسی کی میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ (۲۳)

میر ایک نابغہء روزگار تخلیق کار کی طرح معاصر حالات و واقعات اور ادبی تناظرات کی سیاسی و سماجی جہات سے بہ خوبی آگاہ تھے، لہذا انھوں نے نہ صرف اپنے شعر و ادب میں نہایت بیدار مغزی سے اردو خواں طبقے کے ثقافتی خزینے یعنی ایرانی سرزمین کے رومان پرور لینڈ سکیپ کی بھرپور ترجمانی کی ہے بل کہ فارسیوں کے فکر و فن سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے اپنے منفرد شعریاتی تشخص کی تشکیل میں بھی بڑی

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

سرگرمی دکھائی ہے۔ اردو شاعری میں ایرانی آثار و اقدار کی تخلیقی ترجمانی کا جو طریق کبھی انفرادی سطح پر میر نے متعارف کروایا تھا آج بھی رویہ تیزی سے نشو و ارتقا کے مراحل طے کرتا ہوا ایک موثر رجحان بل کہ روایت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔



حوالے

(۱) میر، کلیات میر، مرتبہ: ظل عباس عباسی، ج: اول، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۳ء)، ۷۴۳۔

(۲) میر، دیوان میر فارسی، مترجمہ: افضل احمد سیّد، (کراچی: اوکسفرڈ، ۲۰۱۳ء)، ۴۔
☆ یہاں صفحاں سے مراد ایران کا معروف شہر اصفہان ہے جو دراصل ”اسپاہان“ سے بنا ہے، مراد: ”گھوڑوں والے“
(۳) ایضاً، ۱۳۸۔

ایرانی شاعر حاجی محمد جان المتخلص بہ قدسی، مشہد مقدس کے رہنے والے تھے جو ۱۶۳۲ء میں برصغیر آئے۔ انھوں نے قصیدے، غزل، رباعی اور مثنوی میں خصوصی نام پیدا کیا۔ فنی چنگی کی بنا پر شاہجہان نے انھیں ایک بار روپوں میں تولا تھا۔

مرزا محمد علی صائب کا تعلق اصفہان سے تھا۔ قریباً چھ برس ہندوستان میں مقیم رہے۔ وطن واپس جا کر بھی انھوں نے ہندوستانی عوام سے تعلق خاطر استوار رکھا۔ رنگین افکار اور معنی آفرینی میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔
معروف ایرانی ادیب ملا طغر امشہدی عہد جہاں گیری کے اوائل میں ہندوستان آئے اور ۱۶۶۸ء میں وفات پائی۔ نظم و نثر دونوں میں خوب رواں تھے۔ شاعری میں غزل اور قصیدہ لکھنا زیادہ مرغوب تھا۔ پُر تکلف نثری اسلوب میں لکھے ہوئے ان کے تیس کے قریب رسالے فارسی ادبیات کا اہم سرمایہ ہیں۔

(۴) غالب، کلیات غالب (فارسی)، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء)، ۶۶۔

(۵) علامہ اقبال، کلیات اقبال، لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، ص ۷۲۔

(۶) قائم چاند پوری: کلیات قائم، مرتبہ: اقتدا حسن، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ۷۶۔

(۷) مصحفی، کلیات مصحفی، دیوان ہشتم، مرتبہ: نور الحسن نقوی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء)، ۹۱۔

اس ضمن میں کچھ ایسے ہی تقابلی بیانیے کا ترجمان ان کا یہ شعر بھی قابل حوالہ ہے:

فارسی اب ہو گئی ہے ننگ اس کے واسطے

فارسی کا ننگ تھا جیسے قرآن ریختہ

کلیات مصحفی، دیوان ششم، مرتبہ: نور الحسن ہاشمی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء)، ۲۴۱۔

اورینٹل کالج میگزین، جلد ۹، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ: ۳۶۶، سال ۲۰۲۲ء

(۸) میر، دیوان میر فارسی، مترجمہ: افضل احمد سیّد، ۶۔

(۹) مرزا غالب کا متعلقہ شعر کچھ یوں ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشتکِ فارسی
گفتہء غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

دیوان غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا راضا، (کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع سوم، ۱۹۹۶ء)، ۲۵۴۔

(۱۰) انور مسعود، در پیش، (کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۱۱۶۔

(۱۱) احمد جاوید، میر کی عظمت کا ایک سبب، مشمولہ: دنیا زاد، مرتبہ: آصف فرخی، (کراچی: شہر زاد، دسمبر ۲۰۰۵ء

تا جنوری ۲۰۰۶ء)، ۶۴۔

(۱۲) ایضاً، ۱۵۴۔

(۱۳) ایضاً، ۲۷۶۔

(۱۴) ایضاً، ۳۳۴۔

(۱۵) حافظ شیرازی، دیوان حافظ، مترجمہ: قاضی سجاد حسین، (لاہور: پراگریسو بکس)، ۳۴۲۔

(۱۶) میر، کلیات میر، مرتبہ: ظل عباس عباسی، ۸۵۹۔

(۱۷) انوری، اوحہ الدین، مشمولہ: گنجینہء گہر، مرتبہ: محمد عالم مختار حق، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،

۲۰۰۸ء)، ۱۹۳۔

میر نے اپنے بیٹے فیض علی کی تعلیم و تربیت کے لیے ”فیض میر“ کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس میں مذکورہ شاعر انوری کو فکاہی انداز میں پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ موصوف ایک دن کسی گوشہء تنہائی میں سر نہیوڑائے بیٹھے تھے کہ پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ مرحوم کے لواحقین بین کرتے جارہے تھے کہ تجھے تنگ و تاریک اور بے چراغ گھر میں لیے جارہے ہیں۔ انوری دوڑ کر گئے اور دریافت کرنے لگے کہ آیا میت ان کے گھر تو نہیں لے جانی جارہی۔ یہ بات شاہی ایوانوں تک پہنچی تو انھیں ایک عالی شان گھر رہنے کو دے دیا گیا۔

(۱۸) میر، کلیات میر، مرتبہ: ظل عباس عباسی، ۱۹۳۔

(۱۹) آذری، اوحہ الدین، مشمولہ: ارمغانِ عالی، (کراچی: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۹۸ء)، ۲۳۴۔

(۲۰) میر، دیوان میر فارسی، مترجمہ: افضل احمد سیّد، ۵۴۔

(۲۱) ایضاً، ۴۹۰۔

(۲۲) ایضاً، ۳۰۴۔

(۲۳) میر، کلیات میر، مرتبہ: ظل عباس عباسی، ۷۵۵۔

BIBLIOGRAPHY

- Asif Farkhi (Ed.) *Dunya Zād*, (Karachi, Sheherzad, December 2005 to January 2006)
- Afzal Ahmad Syed (Trans.) *Devān-i Mīr Farsi*, (Karachi: Oxford, 2013)
- Iqtada Ahsan (Comp.) *Kuliyāt-i Qaim*, (Lahore: Majlis Traqqi-e Adab, 1965)
- Anwar Masood: *Darpesh*, (Karachi: Dost Publications, 2009)
- Sajjad Hussain, Qazi (Trans.) *Devāne-i Ḥafiz*, (Lahore: Progressive Books)
- Zill Abbas Abbasi (Comp.) *Kuliyāt-i Mīr*, vol:I, (New Dehli: Qaumi Council Baray Farooqh-e-Urdu Zuban, 1983)
- Amla Idarat: *Armughan-i ‘Ali*, (Krachi: Pakistan Cooperative Society, 1998)
- Gupta Raza, Kali Daas (Comp.) *Devan-i Ghalib Kamil*, (Karachi: Anjuman Taraqi Urdu, 3rd Edition, 1996)
- Muhammad Iqbal, Allama: *Kuliyāt-i Iqbal*, (Lahore: Sheikh Muhammad Bashir & Sons)
- Mukhtar Haq, Muhammad Aalim: *Ganjīna-i Meher*, (Lahore: Maghrabi Pakistan Urdu Academy, 2008)
- Fazal Lakhnavi, Murtaza Hussain, Syed (Trans.) *Kuliyāt-i Ghailb Farsi*, (Lahore: Majlis Traqqi-e Adab, 1967)
- Noor ul Hassan Hashmi (Comp.) *Kuliyāt-i Mushafī*, 6th Edition, (Lahore: Majlis Traqqi-e Adab, 1994)

